© rasailojaraid.com

تحقیق و تبصرہ

شاہ راہِ مکّہ

عبد الحمید صدّیقی

یورپ میں عام طور پر اسلام اور دنیائے اسلام کے متعلق جس قدر کتب شائع ہوئی ہیں وہ مواد کے اعتبار سے گھٹیا اور استدلال کے نقطۂ نظر سے انتہائی خام ہیں۔ ان کا مطالعہ بالعموم طبیعت پر گراں گزرتا ہے۔ مگر کبھی کبھی ان میں ایسی تالیفات بھی دیکھنے کا اتفاق ہوتا ہے جو اگرچہ فکر کے اعتبار سے اسلام کی صحیح ترجمانی نہ کرتی ہوں لیکن لکھنے والے کی طبع سلیم کی غمازی ضرور کرتی ہیں۔ اس قسم کی ایک کتاب پچھلے سے پچھلے سال لندن سے "روڈ ٹو مکہ" (Road to Mecca) کے نام سے نہایت ہی اونچے طباعتی معیار کے ساتھ شائع ہوئی۔ اب تک اس کتاب کے تراجم دنیا کی متعدد زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں

اس کتاب کے مصنّف اسلامی دنیا کی ایک نامور شخصیت جناب محمد اسد ہیں۔ اس سے پیشتر اُن کی تالیف "اسلام دوراہے پر"، صحیح بخاری کے پہلے چار پاروں کا مشرح انگریزی ترجمہ اور مشہور مجلہ "عرفات" اصحاب فکر سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب میں انہوں نے نہایت ہی ہلکے پھلکے انداز میں جو ایک سفرنامہ کی صورت میں ہے اہلِ یورپ کو اسلامی تعلیمات اور اسلامی دنیا اور اُس کے مسائل سے روشناس کرانے کی کوشش کی ہے۔ کتاب بارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ جس میں سفر کی دلچسپیوں اور کلفتوں کے ساتھ ساتھ بہت سی کام کی باتیں بھی کہی گئی ہیں اور ان سب کو اس خوبی سے ادا کیا گیا ہے کہ قاری اپنے ذہن پہ کوئی بوجھ محسوس نہیں کرتا۔ غالباً "طبع مغرب" کے لئے اسلام کو پیش کرنے کا یہی طرز سب سے زیادہ موزوں ہے۔ تصنیف کا ڈھانچہ ناول کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ جس کے دلچسپ واقعاتی پلاٹ میں نظریۂ اسلامی کی دعوت جا بجا تھوڑی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھوڑی مقدار میں ڈال دی گئی ہے۔ زبان کی ادبیت بہت ہی اونچے معیار کی ہے۔

آغاز میں علامہ اسد نے مسلم قوم کی نفسیاتی کیفیات کا بڑے اچھوتے انداز سے جائزہ لیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :-

اس کتاب میں جو سرگذشت بیان کر رہا ہوں وہ کسی ایسے شخص کی سوانح حیات نہیں جو سیاسی معاملات میں بڑی اہمیت رکھتا ہے، نہ ہی یہ کسی مہم کی داستان ہے یہ کسی ایسے شخص کی آپ بیتی بھی نہیں جس نے بطور خود کوشش کر کے کسی مذہب کی تلاش کی ہو۔ کیوں کہ اس مذہب کو اس نے از خود نہیں ڈھونڈا۔ بلکہ وہ خود بخود بغیر اس کی جدوجہد کے اُس کو مل گیا۔ یہ داستان صرف اس حد تک محدود ہے کہ کس طرح وہ مسلم اقوام کے اندر جذب ہو گیا۔"

اہلِ یورپ کے لئے شاید سب سے زیادہ حیران کن چیز یہ ہے کہ دنیا کی کوئی قوم کسی دوسری قوم کے فرد کو محض چند کلمات پر ایمان رکھنے کی بنا پر قبول کرے، صرف قبول ہی نہ کرے بلکہ اُس کے لئے اپنے دائرے کے اندر ممکن حد تک ترقی کی ساری راہیں کھول دے اور اُسے اپنا مقتدا اور رہبر تک تسلیم کرنے سے گریز نہ کرے۔ اس معاملہ میں نہ تو وطنی تعصبات حائل ہوں، نہ ہی لسانی اختلافات اور نہ ہی رنگ و نسل کے امتیازات۔ با قریب قریب یہی صورت اسد صاحب کے معاملہ میں اہلِ مغرب کو پیش آئی۔ وہ اس بات پر سخت حیران تھے کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک ایشیائی قوم کسی غیر ایشیائی کو اور خصوصاً ایک یورپین کو اتنے اہم منصب پر فائز کر دے کہ وہ یو این او میں اس کی نمائندگی کرے اور وہ بھی ان حالات میں جب کہ سارا عالم اسلام یورپین اقوام کی جارحانہ ملوکیت کی وجہ سے ان سے سخت بدظن ہو چکا ہو۔

انہوں نے ابتداء میں خیال کیا کہ پاکستان نے شاید مغربی قوموں کے اندر کام کرنے کی مخصوص ضرورت کے لحاظ سے ایک یورپین کی خدمات حاصل کی ہیں۔ مگر جب انہوں نے دیکھا کہ یہ شخص شعور اور جذبہ دونوں کے اعتبار سے مسلم قوم سے ہم آہنگ ہو چکا ہے تو وہ اور بھی ششدر ہوئے۔ یہ بات وہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ کس طرح ایک ایسا شخص جو مغرب میں پیدا ہوا ہو، جس نے مغربی ماحول میں تربیت پائی ہو، وہ پوری طرح بغیر کسی ذہنی تحفظ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے، اپنے آپ کو ملّتِ اسلامیہ میں گم کر دے۔ وہ کیوں اپنے تہذیب و تمدن کو جو اُن کے نزدیک اسلامی تہذیب و تمدن سے بدرجہا بہتر ہے ترک کر دے اور بالکل ایک دوسرے رنگ میں رنگ جائے۔ یہ بات جہاں ایک طرف اہلِ مغرب کے لئے حیرانی کا باعث تھی وہاں دوسری طرف اس نے فاضل مصنف کو بھی سوچنے پر مجبور کر دیا وہ اس بات پر پوری سنجیدگی سے غور کرنے لگے کہ آخر کن وجوہ کی بنا پر اہلِ یورپ نے یہ فرض کر لیا ہے کہ اُن کا تمدن مسلم قوم کے تمدن سے بہتر ہے۔ کیا یہ فیصلہ اُن کے غور و فکر کا نتیجہ ہے یا یہ اس تعصب کی کرشمہ سازی ہے جس نے ہر یورپین کے دل میں یہ بات بٹھلا دی ہے کہ جن اقوام کا تہذیبی شجرہ نسب یونانیوں اور رومیوں سے نہیں ملتا وہ سب جاہل اور گھٹیا قومیں ہیں۔ یہ طرزِ فکر یقیناً حالات کے صحیح مطالعہ میں مانع ہے۔ اسی بنا پر یورپ والوں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ دنیا کی اصل تاریخ صرف مغربی تہذیب تمدن کی ہی تاریخ ہے۔ لہٰذا انہیں صرف اسی کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ اس کے علاوہ اور جو کچھ ہے وہ بالکل ناقص اور بیکار ہے۔ اس کا مطالعہ اگر کبھی کیا بھی جائے تو صرف اسی حد تک جہاں تک کہ وہ مغربی تہذیب پر اثر انداز ہو۔ اُن کے نزدیک یورپ ہی دراصل "معیارِ خوب و ناخوب ہے" جو چیز یورپ کے بطن سے پیدا نہیں ہوئی وہ غلط ہے اور جسے یورپ نے جنم دیا ہے وہ سراپا خیر ہے۔

پچھلے چند سالوں میں انسان نے زمان و مکان کی تسخیر میں جو حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ اس سے دنیا کے دور دراز گوشے سمٹ کر ایک دوسرے کے بالکل قریب آ گئے ہیں۔ اب مشرق و مغرب میں وہ پہلا سا حجاب نہیں رہا جو کبھی تھا۔ اسی بنا پر یورپ نے مشرق اور اس کے مسائل کو سمجھنا بھی شروع کیا ہے اور اس سلسلے میں وقتاً فوقتاً مشرقی فلسفہ مشرقی آرٹ اور مشرقی تہذیب عتیق پر کتابیں بھی شائع ہوتی رہتی ہیں۔ مگر فکر و نظر کی یہ تبدیلی صرف اُن تہذیبوں کے بارے میں ہے جن کا مغربی اقدار سے براہِ راست کوئی ٹکراؤ نہیں۔ باقی رہا وہ تمدن جسے اسلامی کہا جاتا ہے اُس کے متعلق یورپ کا رویہ اب بھی بالکل وہی ہے جو آج سے کئی سو سال پہلے تھا۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ آج کا یورپ انتہائی مادیت پرست ہے اس یک رُخی ترقی نے اہلِ یورپ کے سامنے اَن گنت نئے مسائل پیدا کر دیئے ہیں وہ اپنے اندر ایک زبردست "رُوحانی خلا" محسوس کرتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ انہیں کہیں سے چند ایسی روحانی اقدار مل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جائیں جو اُن کی بنیادی اور دل پسند اقدار سے متصادم ہوئے بغیر اُن کی مضطرب رُوح کو قدرے سکون بخش سکیں۔ اسی لیئے وہ ہندو تہذیب کی رُوحانیت خصوصاً بدھ مت سے بے حد متاثر ہیں اور اس کے بارے میں وہ نہایت ہی ہمدردانہ جذبات بھی رکھتے ہیں۔

اس کے برعکس جب وہ اسلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہ یہ دیکھتے ہیں کہ اسلام بذاتِ خود ایک مکمل ضابطۂ حیات اور پورا نظامِ فکر و عمل ہے جس میں اگر ایک طرف خدا اور بندے کے رشتے سے بحث کی گئی ہے تو دوسری طرف انسان اور انسان کے تعلقات پر بھی پوری شرح و بسط سے اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس کے متعلق اسلام نے جامع و مانع احکام نہ دیئے ہوں۔ ایک ہی نقطۂ نظر اور ایک ہی طرزِ فکر سے حیاتِ انسانی کے سارے پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اسلام کی روحانیت کوئی ایسی چیز نہیں جسے اس کے باقی شعبوں سے الگ کر کے اپنایا جا سکے۔ اس دنیا کی زندگی کو ایک خاص طرز سے بسر کرنے کا نام ہی دراصل اسلام ہے۔ یہی روحانیت ہے اور یہی مادیت، یہی دنیا ہے، اور یہی دین۔ ان دونوں کے درمیان کوئی تفریق نہیں۔ اسلام میں جو چیز عقیدہ کی شکل میں روحانیت کہلاتی ہے، وہی جب معرضِ وجود میں آتی ہے تو دین نام پاتی ہے۔ اس بنا پر اسلام کے کسی جزو کا کسی دوسرے نظامِ فکر سے پیوند نہیں لگایا جا سکتا ہے اور نہ ہی یہ دین کسی دوسرے کو گوارا کرتا ہے۔

اہلِ یورپ اگر کبھی اسے قبول کر سکتے ہیں تو صرف اپنا پورا نظامِ حیات بدل دینے کے بعد، ورنہ مغربی تہذیب اور اسلامی تہذیب کے ملاپ کی کوئی دوسری صورت ممکن نہیں ہو سکتی۔ اسی وجہ سے یورپ نے اسلام کو ہمیشہ سے نفرت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ اس کے علاوہ ابھی تک یورپین اقوام کے دل و دماغ میں صلیبی جنگوں کی یاد پوری طرح تازہ ہے۔ ان جنگوں نے اگر یورپ کو ایک طرف یکجہتی عطا کی تو دوسری طرف انہیں اسلام سے پوری طرح بدظن بھی کر دیا۔ فاضل مصنف اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

> صلیبی جنگوں کے تجربات نے یورپ کو ایک تہذیبی شعور اور اتحاد عطا کیا۔ لیکن اسی تجربہ نے اسلام کے معاملہ میں اُن کے دل میں بے حد تعصب بھی پیدا کیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صلیبی جنگوں سے مراد محض کشت و خون نہیں - قوموں کے درمیان کتنی ہی لڑائیاں لڑی گئیں اور پھر اُن کی یاد دلوں سے محو ہو گئی - صلیبی جنگوں سے جو نقصان ہوا وہ صرف اسلحہ کی حد تک ہی محدود نہ رہا - بلکہ یہ زیادہ تر ایک علمی نقصان ثابت ہوا - یعنی ایک سوچی سمجھی تدبیر کے مطابق اسلامی تعلیمات کو توڑ موڑ کر اس طرح پیش کیا گیا کہ اہلِ یورپ اس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے متنفر ہو گئے - اب اگر صلیبی جنگوں کی یاد باقی رکھنا یورپین مفادات کے لئے بے حد ضروری ہے تو اس کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ مسلمانوں کے ہادی ﷺ کو عیسائیت کا دشمن کہا جائے اور آپ کی پیش کردہ تعلیمات کو بداخلاقی کا سرچشمہ بنایا جائے - صلیبی جنگوں کے دوران میں اس خیال کو یورپین دل و دماغ میں پیوست کیا گیا کہ اسلام کشت و خون کی تعلیم دیتا ہے - اس میں سارا زور چند رسومات کی ادائیگی پر ہے اور حقیقی تزکیہ نفس کی اس میں سرے سے کوئی گنجائش ہی نہیں - اسی دور میں خدا کے رسول کا نام تک مسخ کر کے سامنے لایا گیا — وہ رسول جس نے اپنے پیروؤں کو سارے انبیاء کی تعظیم کرنے کی تعلیم دی تھی - یہ وہ زمانہ تھا جب یورپ آزادیٔ فکر سے بالکل ناآشنا تھا - ان حالات سے فائدہ اٹھا کر وہاں کے بااختیار لوگوں نے دینِ اسلام اور تہذیبِ اسلامی کے خلاف نفرت کے بیج بو دیئے ......

تاریخ کی یہ ستم ظریفی ہے کہ اسلام کے خلاف یورپ کی نفرت جو سراسر مذہبی تھی، آج بھی اس کے ذہن میں محفوظ ہے - اگرچہ اب یورپ مذہب سے تو بہت حد تک آزاد ہو گیا ہے - مگر اسلام کے معاملہ میں اس کے تعصبات اسی طرح قائم ہیں - اس میں کوئی چیز بھی حیران کن نہیں - ہم دیکھتے ہیں کہ ایک آدمی اُن سارے مذہبی افکار کو جو بچپن میں اُس پر ٹھونسے گئے تھے، ترک کر سکتا ہے - مگر تازیست اُس کے ذہن کے دُور دراز گوشوں میں ان افکار سے متعلق چند

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جذبات ضرور باقی رہتے ہیں ۔ اسی وجہ سے آج بھی یورپ کے تحت الشعور
میں ان صلیبی جنگوں کے اثرات بدستور موجود ہیں "۔

انہیں اثرات کو دور کرنے کی فاضل مصنف نے اس کتاب میں کوشش کی ہے ۔ اس میں انہوں نے اپنے سفر کی داستان بیان کرتے ہوئے دنیائے اسلام اور تعلیمات اسلامی کے متعلق یورپ کو آشنا کیا ہے جناب محمد اسد پولینڈ کے ایک شہر لو (Luow) جو اس وقت آسٹریلیا کے قبضہ میں تھا سنہ ۱۹۰۰ء میں ایک یہودی گھرانے میں پیدا ہوئے ۔ انہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم خاندانی روایات کے مطابق گھر پر ہی حاصل کی ۔ وہ تیرہ سال کی عمر میں عہد نامہ عتیق عبرانی زبان میں بڑی آسانی کے ساتھ پڑھ سکتے تھے یہی وہ وقت تھا جب انہوں نے اپنے آبائی مذہب یہودیت کے متعلق غور و فکر شروع کیا ۔ چنانچہ اس کے متعلق وہ اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

یہ بات یقینی ہے کہ مجھے اُن اخلاقی اصول و ضوابط سے کوئی اختلاف نہ تھا ، جن پر یہود کی مقدس کتب میں زور دیا گیا ہے ، نہ مجھے انبیائے یہود کی خدا شناسی کو قبول کرنے میں کوئی تامل تھا ۔ لیکن میں نے دیکھا کہ عہد نامہ عتیق اور تالمود کا خدا اُن رسومات پر غیر معمولی حد تک زور دیتا ہے جس کے ذریعہ انہیں اُس کی پرستش کرنی چاہیئے ۔ میں نے اس پر بھی غور کیا کہ اس خدا کا صرف ایک عبرانی قوم سے ہی تعلق کیوں ہے اور وہ صرف اسی کی قسمت کے بارے میں کیوں سوچتا ہے ۔ وہ کوئی پوری نوع انسانی کا رب نہ تھا ، بلکہ صرف ایک قبائلی دیوتا تھا جس کا مقصد ساری انسانیت کو اپنے اُن چہیتوں کی ضروریات کے تابع کرنا تھا ۔ یہ چہیتے جب نیک راہ پر چلتے وہ انہیں فتوحات سے نوازتا اور اگر غلط راہ اختیار کرتے تو انہیں کافروں کے ہاتھ سے سزا دلواتا ۔ تعلیمات میں ان اصولی خامیوں کے پیش نظر مجھے بعد کے انبیا کے اخلاقی ضابطوں میں وہ ہمہ گیری نظر نہ آئی جو در اصل ہونی چاہیئے تھی ۔"

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مذہب کے اس تنگ تصور نے انہیں مذہب سے متنفر کر دیا اور اس معاملہ میں اُن کی بچپن کی تعلیم ذرا کام نہ آئی۔ وہ برابر مذہب اور اس کے "تکلفات" سے دور ہوتے چلے گئے۔ اسی اثنا میں پہلی جنگِ عظیم چھڑ گئی، اور جناب اسد صاحب فوج میں ایک فرضی نام کے ساتھ بھرتی ہو گئے۔ جنگ کے خاتمے پر انہوں نے آرٹ، ادب اور اسی طرز کے دوسرے موضوعات پر مطالعہ شروع کیا۔ مگر اس مطالعہ میں کوئی ترتیب نہ تھی، جس کی وجہ سے اُن کے ذہن کو سکون نصیب نہ ہو سکا۔

جنگ کے بعد یورپ جس زبردست قسم کے رُوحانی بحران سے دوچار ہوا، اس کے بارے میں فاضل مصنف نے اپنا مطالعہ و تاثر تفصیل سے ہمارے سامنے رکھا ہے۔ ان کی گفتگو کا خلاصہ مدعا یہ ہے:-

جنگ اگرچہ ختم ہو چکی تھی مگر لوگوں میں طمانیت قلبی نہ تھی۔ وہ ہراساں اور انتہائی پریشان تھے۔ ایک دوسرے کے خلاف دلوں میں نفرت اور حسد کی آگ بھڑک رہی تھی۔ پرانی اقدار جن پر ابھی تک یورپین معاشرت قائم تھی ایک ایک کر کے ختم ہو رہی تھیں اور اُن کی جگہ نئی اقدار جنم لے رہی تھیں۔ اس وقت یورپ کے پاس کوئی اخلاقی معیار ایسا نہ تھا جسے سب کے سامنے پیش کیا جا سکے اور وہ اُسے قبول کر لے۔ سائنس کا نعرہ تھا "ادراک ہی سب کچھ ہے" مگر اُسے معلوم نہ تھا کہ ادراک بغیر اخلاقی نصب العین کے بالکل بیکار ہے اور وہ تباہی اور بربادی کی طرف لے جانے والا ہے۔ معاشرتی مصلحین، انقلاب کے شیدائی اور اشتراکی سب کے سب خارجی تبدیلیوں میں ہی انسانی فلاح ڈھونڈھ رہے تھے۔ دوسری طرف خدا کے پرستار اصلی مشن کو فراموش کر چکے تھے۔ اُن کا کام اب صرف اسی قدر رہ گیا تھا کہ وہ اپنے ذہن میں من مانے خیال گھڑ گھڑ کر انہیں خالقِ کائنات کی طرف منسوب کرتے رہیں۔ مذہب کوئی حیات آفریں اور زندہ جاوید تحریک نہ تھی۔ بلکہ یہ چند بے جان رسومات کا مجموعہ بن چکا تھا۔ ذہین لوگ جب یہ دیکھتے کہ خدا کی جو جو صفات یہ مذہبی لوگ بیان کر رہے ہیں۔ دنیا کے واقعات اُن کی برابر تردید کرتے جا رہے، تو وہ مذہب کو ہی خیرباد کہہ دیتے۔ اسوقت مجھے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس بات کا شدید احساس ہوا کہ کسی ایسے طرزِ زندگی کی تلاش کی جائے جو حیاتِ انسانی کو شاد کام بنا دے۔ چنانچہ اس کی جستجو میں میں پہلے آرٹ کی طرف متوجہ ہوا۔ میرا خیال تھا کہ آرٹ کا اصل مقصد یہ ہے کہ خارجی زندگی کے مختلف شعبوں میں جو اختلافات پائے جاتے ہیں، اُن کی علت ہمیں سمجھائے اور یہ بتائے کہ ظاہری سطح کے نیچے ایک پلان کام کر رہا ہے۔ اختلاف جو کچھ ہے وہ ظاہر میں ہے باطن میں نہیں اور زندگی کے سارے سرچشمے ایک ہی مرکز سے پھوٹتے ہیں۔ زندگی حقیقت میں ہم آہنگ ہے۔ خواہ وہ ہم رنگ نہ ہو۔ بدقسمتی سے جو نصاب مجھے پڑھایا جا رہا تھا وہ مجھے مطمئن نہ کر سکا۔ میرے اساتذہ بھی میری تشفی نہ کر سکے۔ چنانچہ میں آرٹ کے مطالعہ کو چھوڑ کر نفسیات کی طرف متوجہ ہوا۔

علمِ نفسیات میں مجھے بے حد دلچسپی پیدا ہوئی۔ اس میدان میں وقت کی ایک عظیم الشان علمی تحریک کام کر رہی تھی۔ اس نے لوگوں کے فکر کے زاویوں کی لکیر کو بدل دیا۔ انسان نے ظاہری اعمال کے پس پردہ جھانک کر اُن محرکات کا کھوج لگانا شروع کیا جن کی وجہ سے وہ معرضِ وجود میں آتے ہیں۔ اس سے انسان کی توجہ خارج سے ہٹ کر داخلی کیفیات کی طرف مبذول ہوئی۔ مجھے خاص طور پر فرائڈ کے نظریات نے بے حد متاثر کیا اور میں کئی شامیں وائنا کے مشہور ہوٹل میں الفرڈ، اڈلر اور ہرمان کے ساتھ گذارتا اور اُن کی دلچسپ گفتگو سے محظوظ ہوتا۔ اگرچہ مجھے اس سائنس کے اصول و مبادی اور اس کے طرزِ تحقیق سے کوئی زیادہ اختلافات نہ تھا۔ مگر مجھے اس علم کی بے جا خود اعتمادی پسند نہ آئی۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا یہ کس طرح ممکن ہے کہ انسانی اعمال جن کے محرکات انتہائی پیچیدہ اور اُلجھے ہوئے ہیں، انہیں علم کیمیا کی طرح سادہ اجزا میں تحلیل کیا جا سکے اور اُن کے بارے میں قطعیت سے یہ کہا جا سکے کہ اُن کا محرک شہوانی یا اسی قسم کا کوئی اور منفی جذبہ ہی رہا ہے۔"

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسد صاحب کی تائید میں ہم یہ کہیں گے کہ جس طرح انسان کا جسم بے حد پیچیدہ ہے۔ اسی طرح بلکہ اس سے کہیں زیادہ پیچیدگی اس کے احساسات میں پائی جاتی ہے۔ شاید کسی گہرے سے گہرے سمندر میں اس قدر گہرائی نہ ہو جتنی کہ انسان میں ہے اس لئے اس کی سطح پہ تیرتی ہوئی چند سیپیوں کو، جو اوپر کی لہروں میں گم تھیں، دریافت کرنے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ یہ ماہرین نفسیات سمندر کی تہہ سے موتی ڈھونڈھ لائے ہیں۔ ان کے نزدیک انسان چونکہ نرا حیوان ہے اس لئے انہوں نے اس کے اعمال کے محرکات کو بھی سراسر اس کے حیوانی پہلو میں تلاش کیا ہے کاش اسد صاحب تحلیلِ نفسی پر اس نقطۂ نظر سے بحث کرتے۔

مغربی ذہن چونکہ انسانیت کے بارے ایک انتہائی مایوس کن اور تاریک تصور رکھتا ہے اس لیئے اس نے تحلیلِ نفسی میں انسان کے تاریک ترین پہلوؤں کو ہی اُجاگر کرنے کی ہی کوشش کی ہے۔ اُس کا ادعا یہ ہے کہ وہ اعمال جو بظاہر نہایت ہی پاک اور شریفانہ معلوم ہوتے ہیں اُن کے محرکات بھی انتہائی ذلیل اور گھناؤنے ہیں۔ نیکی، تقویٰ، شرافت، دیانت، صداقت ایسے انسانی اخلاق جن کو دنیا نے ہمیشہ پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔ اور جن کی ہمیشہ انسانوں نے قدر کی، وہ بھی اپنے اصل کے اعتبار سے نہایت گھٹیا اور پست ہیں۔ تبصرہ نگار کا خیال ہے کہ شرافت کی اقدار کی جس قدر مٹی تحلیل نفسی نے پلید کی ہے وہ شاید کسی اور نے نہیں کی۔ پھر انسانی اعمال کو اس طریقہ پر تحلیل کرتے ہوئے اس حقیقت کو یکسر نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ یہ تجزیہ سراسر ایک سلبی یا منفی حیثیت رکھتا ہے۔ چلیئے ایک لمحہ کے لئے ہم یہ فرض کر لیتے ہیں تحلیل نفسی سے ہم اُن ذہنی الجھنوں کا کھوج لگا لیتے ہیں جو انسان میں بعض خارجی وجوہات کی بنا پر پیدا ہو جاتی ہیں ہم یہ بھی مان لیتے ہیں کہ علم نفسیات ان الجھنوں کو دور کرنے میں بالکل کامیاب بھی ہو جاتا ہے اور اس وجہ سے اس کی زندگی بالکل متوازن ہو جاتی ہے۔ مگر اصل سوال اپنی جگہ پر موجود رہتا ہے کہ اس متوازن زندگی کو کس کام میں لگایا جائے اسے کس مقصد میں کھپایا اور صرف کیا جائے۔ نفسیات زیادہ سے زیادہ ہمیں نقطۂ صفر (ZEROPOINT) پر لا کر چھوڑ دیتی ہے۔ لیکن انسان جب تک انسان ہے کبھی بھی اس نقطہ پر قانع نہیں ہو سکتا۔ اُسے بہرحال زندگی گزارنے کے لئے ایجابی طور پر بھی کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے۔ زندگی بغیر چند ایجابی اقدار کے کبھی گزاری نہیں جا سکتی۔ تحلیل نفسی کے ماہرین بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ انسان کی بے شمار الجھنیں ایسی ہیں۔ جن کو بعض زبردست

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قسم کے ایجابی محرکات ہی دُور کر سکتے ہیں ۔ اس معاملہ میں رضاء الٰہی کا حصول فکرِ آخرت اور چند پاک باز انسانوں کی پیروی کا جذبہ میرے نزدیک چند ایسے طاقتور محرکات ہیں جو ہماری بہت سی نفسیاتی الجھنوں کو دور کرنے میں بہت زیادہ ممد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں ۔

فاضل مصنف کا حساس دل صنعتی انارکی کے اس سیلاب سے بھی بے حد متاثر ہوا ۔ جو یورپ میں خطرناک تیز رفتاری کے ساتھ پھیل رہا تھا ۔ انھوں نے یہ محسوس کیا ۔ کہ یہ خیال کہ سائنس کی ترقیاں اُسے معاشرتی اعتبار سے بھی ترقی کی راہ پر لے جا رہی ہیں بالکل خام ہے آزادی جس کے لئے لوگوں میں بے حد تڑپ تھی اور جس کے حاصل کرنے کے لئے انھوں نے نہ صرف جسمانی قربانیاں دیں ۔ بلکہ اپنی ان اقدار کو بھی قربان کر دیا جن پر کہ اُن کا معاشرہ قائم تھا ۔ وہ اپنے چاہنے والوں کے لیے وبالِ جان بنتی جا رہی ہے ۔

اس مضطرب کیفیت میں زندگی ان "قلب سلیم" پر گراں ہو رہی تھی ۔ چنانچہ انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ زندگی کو اب کسی دوسرے کی مستعار عینک سے نہیں دیکھیں گے ۔ بلکہ وہ زندگی کے تلخ و شیریں حقائق سے خود دوچار ہو کر اس کے تجربات حاصل کریں گے ۔ اس مقصد کے لئے انھوں نے اخبار نویسی کا پیشہ اختیار کرنے کا عزم کیا ۔ اس کا حصول کوئی آسان کام نہ تھا مگر وہ اپنی خداداد ذہانت ، تندہی اور محنت شاقہ سے اس مقصد میں کامیاب ہوئے اور یونائیٹڈ ٹیلیگراف کے نمائندے کی حیثیت سے اُنھوں نے اسلامی ممالک کا سفر کیا ۔ اس سفر کے دوران ہی میں انھوں نے اسلام ایسی نعمتِ عظمیٰ کو پایا ۔ وہ سب سے زیادہ مسلمانوں سے متاثر ہوئے ۔ انھوں نے یہ دیکھا کہ یہ لوگ اپنی گئی گزری حالت میں بھی مغرب کے مقابلہ میں زیادہ قانع ہیں ۔ قناعت کی یہ اندرونی کیفیات جن کے پرتو اُن کی خارجی زندگی پر بھی پڑ رہے تھے ۔ اسد صاحب کے لئے جاذبیت کا باعث بنے اور اس سے انھوں نے اُس عظیم فرق کی علت معلوم کرنے کی کوشش کی جو مسلمانوں اور یورپین کے درمیان پایا جاتا ہے ۔ یہی تلاش و جستجو انھیں اسلام کے قریب لے آئی ۔ اور بالآخر انھوں نے اسے پورے شعور اور جذبات کے ساتھ قبول کر لیا ۔

اسلام کے سرچشمہ تک پہنچنے کے لئے انھیں جن راہوں پر سے گزرنا پڑا ۔ اُن کی تفصیلات بڑی ہی دلچسپ ہیں ۔ انھوں نے سب سے پہلے انسانی فطرت کے بنیادی سوالات پر سوچنا شروع کیا ۔ مثلاً

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خیر و شر کیا ہے یہ تقدیر کیا ہے۔ ایک فرد اپنی زندگی کو کس طریق پر ڈھالے جس سے اسکی زندگی اور تقدیر ایک ہو جائیں؟ اس قسم کے سوالات اُن کے ذہن میں ہمیشہ ہجوم کرتے وہ ان کے جوابات کے ہر وقت آرزومند تھے۔ ذہن کا یہ اضطراب انہیں کبھی سکون و اطمینان سے بیٹھنے نہ دیتا۔

یہ تھی اُن کی داخلی کیفیت۔ خارجی زندگی بھی پریشان کن تھی۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد یورپ کے اخلاقی و معاشرتی انحطاط نے اہل یورپ کو سخت مایوس کر دیا تھا۔ اس یاس و قنوطیت کے اثرات کو کم کرنے کے لئے اُنہوں نے گانے بجانے، مصوری اور تھیٹر کی طرف توجہ کی اور ان مصنوعی طریقوں سے اپنے غم کو فرحت و انبساط میں تبدیل کرنے کی سعی کی۔ اس میں کسی حد تک وہ کامیاب تو ہوئے مگر وہ مسافی کی جو درحقیقت کسی انسان سے اس کا سکون و اطمینان چھین لیتی ہے وہ اس کی طرف متوجہ نہ ہوسکے۔ اہل یورپ کا اب ایک ہی نصب العین تھا کہ کسی طرح زیادہ سے زیادہ دنیاوی فوائد و لذائذ سمیٹے جائیں نقطہ نظر کی اس بنیادی تبدیلی کی وجہ سے یورپ میں بسنے والا ہر فرد خود غرضی کا پتلا بن گیا۔

اپنے ان تاثرات کو انہوں نے مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

میں اگرچہ جوان تھا، مگر یہ امر مجھ سے پوشیدہ نہ تھا کہ پہلی جنگ عظیم کی تباہ کاریوں کے بعد بھی یورپ نے اپنی زندگی کے زاویے کو درست نہیں کیا۔ اہل یورپ کا حقیقی خدا کوئی روحانی قسم کا نہ تھا۔ اُن کا معبود صرف مادی آسائش تھی اور اس کو حاصل کرنے کے لئے وہ ہمیشہ سرگرم رہتے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یورپ میں اس وقت بھی ایسے اشخاص پائے جاتے ہیں جو دینی طریقہ پر سوچتے ہیں اور مذہبی احساس رکھتے ہیں اور اپنے عقائد کو اپنی تہذیبی روح کے ساتھ منطبق کرنے میں امکانی کوشش بھی کرتے ہیں۔ مگر یہ مستثنیٰ مثالیں ہیں۔ یورپ کا عام اور متوسط آدمی خواہ وہ جمہوریت پر ایمان رکھتا ہو یا فاشزم پر، سرمایہ دار ہو یا اشتراکی، جسمانی مشقت کرنے والا ہو یا دماغی محنت کرنے والا۔ وہ ایک ہی مذہب رکھتا ہے۔ اور وہ مادی ترقی کی پرستش

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے اور اس کی غایت حیات یہ ہے کہ وہ زندگی کو زیادہ سے زیادہ آسان پُر راحت، اور عام محاورے کے مطابق قدرت سے آزاد بنائے۔ اس مذہب کے معابد بڑے بڑے کارخانے "کیمیاوی دار الصنعت" ناچ گھر اور بجلی کے مراکز ہیں۔ اس مذہب کے پیشوا بنکوں کے افسر، انجینئر، اداکار اور بڑی بڑی صنعتوں کے ناظمین اور ریکارڈ قائم کرنے والے ہوا باز ہیں۔ یہاں اخلاقی انحطاط کا اندازہ اس ایک امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ لوگ ابھی تک اس بات پر متفق نہیں ہو سکے کہ خیر کیا ہے اور شر کیا ہے۔ انہوں نے اپنے سارے معاشی اور معاشرتی مسائل کو ایک ہی اصول سے حل کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ ہے "عملی افادیت" اور یہ وہ حسینہ ہے جو اپنے آپ کو ہر وقت اس شخص کے سپرد کرنے کے لئے تیار رہتی ہے جو اسے حاصل کرنے کی ذرا بھی آرزو رکھتا ہو۔ قوت اور مسرت کے اس پجاری پن کا لازمی اثر یہ ہے کہ مغربی سوسائٹی ایسے متحارب گروہوں اور جماعتوں میں بٹ گئی ہے۔ جو ہمیشہ کیل کانٹے سے لیس اس بات کے منتظر رہتے ہیں کہ جب کبھی ان کے مفادات ٹکرائیں تو وہ ایک دوسرے کو تباہ برباد کر کے رکھ دیں تمدنی نقطہ نظر سے اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہاں انسانوں کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا ہے جس کا اخلاق اس کے دنیاوی فوائد کا تابع ہے اور جس کے نزدیک خیر و شر کا بلند ترین معیار مادی کامیابی ہے۔

"میں نے دیکھا کہ ہماری زندگی کتنی پریشان کن اور دکھی ہے۔ ہم ہر وقت اجتماعیت، قوم، اور ملت پکارتے رہتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود انسان اور انسان کا باہمی رشتہ کمزور ہو گیا ہے۔ ہمارے احساسات نے ایک نہایت غلط صورت اختیار کر لی ہے۔ میں یہ حالات خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا لیکن مجھے دوسرے اہل مغرب کی طرح کبھی اس بات کا گمان تک نہ ہوتا کہ ہم ان پیچیدگیوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے حل تلاش کرنے کے لیے یورپ سے باہر والی دنیا کی طرف بھی دیکھ سکتے ہیں۔ ہمارے فکر کا نقص اپنی تہذیب کے اردگرد ہی گھومتا تھا۔"

فاضل مصنف کے دل میں ابھی اس قسم کے احساسات پرورش پا رہے تھے کہ انہیں ایک چینی حکیم LAO-TSE کی کتاب ہاتھ لگی۔ اس کتاب کے ذریعہ جناب اسد صاحب پہلی بار ایک ایسے سماج سے متعارف ہوئے جو ہر قسم کی رقابتوں، ریشہ دوانیوں، زبردست آزاریوں سے پاک تھا۔ اس کتاب نے انھیں اس حقیقت کی طرف بھی رہنمائی کی کہ مادی ترقی خواہ انسانی زندگی کے لئے کتنی ضروری اور فائدہ مند ہو مگر اسے کبھی بھی منتہائے مقصود نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ اس لئے جو لوگ صرف خارجی ماحول یعنی معاشی، سیاسی اور معاشرتی حالات میں تبدیلی کر دینے سے انسانیت کو آرام و سکون میسر کرنے کے آرزومند ہیں وہ جنت الحمقا میں بستے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

مجھے یہ تو علم نہ تھا کہ اس پریشانی کا حل مجھے کہاں ملے گا۔ مگر میرے معصروں نے مادی ترقی سے جو امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں مجھے ان پر کوئی بھروسہ نہ رہا۔

جناب اسد صاحب اس قسم کی ذہنی کشمکش میں مبتلا تھے کہ انہیں اپنے ایک ماموں کے ہاں سے جو فلسطین میں رہتا تھا۔ آنے کی دعوت موصول ہوئی جس کو انہوں نے بخوشی قبول کیا اور اخبار کی ملازمت ترک کر کے وہاں روانہ ہو گئے۔ انہوں نے اس سرزمین کے حسن کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا اور یہی چیز ان کے لئے باعث کشش تھی اور یہ علم نہ تھا کہ تقدیر ان کے لئے کچھ دوسرے فیصلے کر چکی ہے۔ اسلام کے متعلق ان کی معلومات صرف اسی قدر تھیں کہ یہ بھی زندگی کے دوسرے حادثات کی طرح ایک تاریخی حادثہ ہے اور اخلاقی اور روحانی اعتبار سے یہ مسیحیت اور یہودیت سے کسی صورت بھی بہتر نہیں۔ بلکہ ان سے کہیں کم تر ہے۔

دوران سفر میں وہ عربوں کی زندگی سے متعارف ہوئے۔ اس زندگی میں بے شمار خامیاں تھیں۔ مگر اسد صاحب کو جس چیز نے بے حد متاثر کیا وہ ان کی فراخدلی اور اطمینانِ قلب تھا وہ اس بات پر سخت حیران تھے کہ یہ لوگ کیوں کر ہر شخص کی مہمان نوازی میں اس قدر مسرت محسوس کرتے ہیں۔ وہ غریب اور نادار ہیں مگر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کے باوجود طمانیت قلب کی دولت سے مالا مال ہیں۔ اُن کے ذہنوں میں مال و دولت سمیٹنے کا ہسٹیریا نہیں۔ وہ ہر حال میں اپنی تقدیر پر قانع ہیں۔

اسد صاحب نے اپنے ماموں کے ساتھ یوروشلم کے شہر میں رہنا شروع کر دیا۔ اُن کا مکان برلب سڑک تھا اور وہ ہر وقت آتے جاتے قافلوں کو دیکھتے رہتے۔ اس منظر نے اُن کے ذہن کو جس طرح متاثر کیا وہ پڑھنے کے قابل ہے۔ وہ فرماتے ہیں:۔

"یہ لوگ غریب اور چیتھڑوں میں ملبوس تھے۔ مگر ان کی حرکات و سکنات سے یوں معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کہ وہ بہت بڑے نواب ہیں۔ جب وہ اکٹھے زمین پر کھانے کے لیے بیٹھتے اور روکھی سوکھی روٹی پنیر یا زیتون کے ساتھ کھانا شروع کرتے تو مجھے اُن کی زندگی کا یہ بے ساختہ پن اور ذہنی اور قلبی اطمینان بےحد متاثر کرتا۔

دن میں وہ کئی مرتبہ نماز کے لئے جمع ہوتے۔ تمام لوگ ایک امام کے پیچھے ایک لمبی قطار میں کھڑے ہو جاتے۔ وہ اکٹھے ہی مکہ کی طرف منہ کر کے اپنے امام کی پیروی میں قیام، رکوع اور سجود کرتے"

مسلمانوں کی اس نماز کو دیکھ کر میرے ذہن میں ایک سوال پیدا ہوا اور وہ یہ تھا کہ حقیقی عبادت کے ساتھ جسمانی حرکات کس طرح ہو سکتی ہیں۔ اپنی اس خلش کا اظہار میں نے ان کے امام سے کیا اور اس سے یہ پوچھا۔

"کیا تمہارا واقعی اس بات پر ایمان ہے کہ خدا تم سے عبادت کے وقت قیام رکوع اور سجود ایسی جسمانی حرکات کا مطالبہ بھی کرتا ہے۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ تم خاموشی کے ساتھ دل کی گہرائیوں سے یادِ الٰہی میں مصروف رہو۔ آخر ان جسمانی حرکات کا کیا فائدہ ہے"۔

امام میرے اس سوال سے بالکل رنجیدہ نہ ہوا، وہ ذرا مسکرایا اور پھر کہا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"ہم اس طریقہ کو چھوڑ کر عبادت کا کونسا دوسرا طریقہ اختیار کریں۔ کیا ہمارے رب نے ہماری روح کے ساتھ ہمارا جسم پیدا نہیں کیا۔ اور اگر حقیقت یہی ہے تو کیا ہم پر یہ لازم نہیں آتا کہ ہم اپنے روح کے ساتھ اپنے جسم کی عبادت کا بھی ثبوت دیں۔ سنئے کہ ہم مسلمان اس طرح کیوں عبادت کرتے ہیں۔

سب سے پہلے ہم اپنے چہروں کو خانہ کعبہ کی طرف پھیرتے ہیں مسلمان جہاں کہیں ہوں گے نماز کے وقت اسی طرف متوجہ ہوں گے۔ یہ اس حقیقت کا بین ثبوت ہے کہ پوری مسلم قوم ایک جسم ہے اور ہمارے خیالات کا مرکز صرف خدا ہے۔ اس کے بعد ہم سیدھے کھڑے ہوتے ہیں اور اس ایمان کے ساتھ قرآن پاک کی آیات تلاوت کرتے ہیں کہ یہ اس کا اپنا کلام ہے اور ہمیں اس سے اس لئے نوازا گیا ہے کہ ہم نیکی اور پرہیزگاری کی راہ پر گامزن ہوں۔ پھر ہم اللہ اکبر کہتے ہیں اور یہ کلمہ ہمارے اندر یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ کوئی بھی اللہ کے علاوہ معبود نہیں اس لئے صرف وہی اکیلا ہی پرستش کے لائق ہے۔ اس کے بعد ہم رکوع میں جاتے ہیں اور اس کی بزرگی بیان کرتے ہیں۔ پھر پیشانیاں زمین پر رکھدی جاتی ہیں اور یہ حرکت اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ اس بزرگ و برتر ہستی کے سامنے ہماری حیثیت مشتِ خاک سے زیادہ کچھ بھی نہیں وہی ہمارا رب اور کارساز ہے اس کے بعد ہم اپنے چہروں کو اٹھا لیتے ہیں اپنے گناہوں کی معافی اور رحمتوں کے نزول کے لئے دعائیں مانگتے ہیں۔ پھر سجدہ میں چلے جاتے ہیں۔ اور دوبارہ اٹھ کر کچھ وقفہ کے لئے بیٹھ جاتے ہیں۔ اس اثناء میں ہم خدا تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ محمد رسول اللہ کو جن کے ذریعہ ہمیں یہ پیغام ملا اپنے پیشرو انبیا کی طرح اپنی خاص رحمتوں سے نوازے وہ ہم پر بھی اور ان لوگوں پر بھی جو حق کے راستے پر گامزن ہوتے اپنا کرم کرے۔ وہ ہمیں اس دنیا میں بھی بھلائی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عطا فرمائے اور آخرت میں بھی ۔ آخر میں ہم اپنے چہروں کو دائیں اور بائیں پھیرتے ہوئے کہتے ہیں "تم پر اللہ کی رحمت اور سلامتی ہو" یہی وہ طریقہ ہے جس کے مطابق ہمیں ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادت کرنا سکھائی ہے ۔ تاکہ ہم از خود اپنے آپ کو خدا کے حوالے کر دیں ۔ یہی در اصل اسلام ہے اور اسی طرح ہم اپنے خالق اور مقدر کے ساتھ اپنے آپ کو ہم آہنگ کر سکتے ہیں"۔

"کافی مدت گزر جانے کے بعد مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ حاجی کی اس سادہ تشریح نے میرے لیے اسلام کے پہلے دروازے کو کھول دیا ہے ۔ اسلام لانے کے بات پہلے جب مجھے کبھی اس بات کا گمان تک نہ تھا کہ میں اس دین پر ایمان لے آؤں گا ۔ میں جب کبھی بھی کسی شخص کو ننگے پاؤں کسی کپڑے یا چٹائی یا زمین پر سر جھکائے ہاتھ سینے پر رکھے اور اپنے آپ میں غرق پایا تو میرا اپنا دل ایک خاص قسم کے عجز سے لبریز ہو جاتا"

کچھ مدت کے بعد اسد صاحب کو فلسطین کی سیاست سے بھی دلچسپی پیدا ہونے لگی ۔ اس سے پیشتر اُن کے دل میں یہ خیال تھا کہ فلسطین میں عربوں کی آبادی یہودیوں کی نسبت بہت کم ہے ۔ مگر جب حقیقت حال کا مطالعہ شروع کیا تو انہیں معلوم ہوا کہ یہ ملک تو در اصل عربوں کا ہے ۔ اور اس میں ان کی تعداد یہودیوں سے پانچ گنا زیادہ تھی ۔ جب انہوں نے اس مسئلہ کے متعلق صیہونی تحریک کے صدر سے گفتگو کرنا چاہی ۔ تو اس نے نہایت نفرت بھرے لہجے میں کہا ۔

" ہمارے خلاف عربوں کی کوئی تحریک نہیں ۔ ایک ایسی تحریک جس کی جڑیں عوام کے دلوں میں گہری نقش ہوں ۔ جسے عام طور پر مخالفت سمجھا جا رہا ہے وہ چند شر پسند لوگوں کی محض نعرہ بازی ہے ۔ یہ لوگ چند مہینوں یا سالوں کے بعد خود بخود ہی ٹھنڈے پڑ جائیں گے"۔

علامہ اسد صاحب اس مسئلہ پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں ۔

صیہونی تحریک کے صدر کا یہ جواب مجھے کسی صورت میں بھی مطمئن نہ کر سکا ۔ مجھے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آغاز ہی سے اس بات کا احساس ہو چکا تھا کہ یہودیوں کی فلسطین کی سرزمین میں آباد کاری بالکل مصنوعی ہے اور اس کا سب سے برا پہلو یہ ہے کہ اس طریق سے اہل یورپ مغربی زندگی کی ساری پیچیدگیوں اور پریشانیوں کو ایک ایسی سرزمین میں منتقل کر دینے کا ارادہ کر چکے ہیں جو اس سے پیشتر اس قسم کی الجھنوں سے بالکل پاک تھی۔ یہودی وہاں اس طرح نہیں آ رہے تھے جس طرح کہ کوئی بن باس سے واپس آتا ہے اس کے برعکس وہ یورپین طرز پر یورپین مقاصد کے ساتھ ایک ملک تعمیر کرنے کا عزم رکھتے تھے۔ اس لحاظ سے وہ اپنے گھر ہی میں بالکل اجنبی تھے۔ جب بھی عرب یہودیوں کے ان عزائم کے خلاف جدوجہد کرتے تو مجھے کوئی حیرت نہ ہوتی۔ بلکہ اس کے برعکس مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ اس وقت دراصل عرب ہی ستم کا تختۂ مشق بنے ہوتے ہیں اور وہ اس قسم کے غاصبانہ رویہ کے خلاف اپنی مدافعت کرنے میں بالکل حق بجانب ہیں۔ اگرچہ میں اپنے نسب کے اعتبار سے یہودی ہوں۔ لیکن مجھے صیہونیت سے ایک طرح کی نفرت تھی۔ مجھے صرف عربوں سے ہمدردی تھی بلکہ مجھے یہ بات اخلاق کے بالکل منافی نظر آتی کہ کچھ لوگ بیرونی طاقت کے سہارے باہر سے لا کر ایک ملک میں اس نیت سے آباد کئے جائیں کہ انہیں چند سالوں میں وہاں کی اکثریت بنانا ہے جب کبھی بھی یہ مسئلہ سامنے آتا تو میں ہمیشہ عربوں کی حمایت کرتا۔ میرا یہ طرزِ عمل سارے یہودیوں کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ وہ ہمیشہ اس حقیقت تک پہنچنے سے قاصر رہے کہ میں کیوں عربوں کی حمایت کرتا ہوں۔ عرب اُن کے نزدیک پس ماندہ افراد کا ایک گروہ تھا اور وہ انہیں اُس سے بھی زیادہ نفرت حقارت سے دیکھتے جتنے کہ یورپین آباد کار وسطی افریقہ میں وہاں کے اصلی باشندوں کو دیکھا کرتے تھے۔ عربوں کے خیالات و تصورات سے انہیں قطعاً

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اُن کے ذہن میں یہ خیال اچھی طرح راسخ ہو چکا تھا کہ کہ فلسطین یہودیوں کا ملک ہے۔"

اس سلسلہ کی ایک بحث جو فاضل مصنّف نے صیہونی تحریک کے سب سے بڑے رہنما ڈاکٹر ویزمین (WEIZ MAN) سے کی نہایت دلچسپ ہے۔

جناب اسد صاحب نے اس سے سوال کیا۔

"تم اس سرزمین کو اپنا ملک کس طرح بنا سکتے ہو جب کہ عرب جو اکثریت میں ہیں تمہارے اس عزم کے سخت مخالف ہیں"۔

اس نے کہا۔ "ہمیں یقین ہے کہ چند سالوں کے بعد عرب اکثریت میں نہیں رہیں گے۔"

اسد صاحب نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا۔

"ممکن ہے ایسا ہی ہو چونکہ تم اس مسئلہ سے کئی سالوں سے متعلق ہو۔ اس لئے تم اسے مجھ سے بہتر طور پر سمجھتے ہو۔ لیکن سیاسی دقتوں کے علاوہ اس مسئلہ کا ایک اخلاقی پہلو بھی تو ہے۔ کیا یہ غلط نہیں کہ تم اس ملک سے ان لوگوں کو نکالنے کا ارادہ رکھتے ہو جو اس سرزمین پر ہمیشہ سے رہ رہے ہیں"۔

ڈاکٹر نے فوراً کہا۔

یہ ہمارا اپنا ملک ہے۔ ہم صرف اُسی چیز کو واپس لینا چاہتا ہیں جو ہم سے ناانصافی کے ساتھ چھینی گئی تھی"۔

اسد صاحب نے اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:۔

"تمہارا اس ملک سے دو ہزار سال سے کوئی تعلق نہیں رہا ہے اس سے پیشتر تم نے اس کے ایک حصہ پر پانچ سو سال حکومت کی۔ اگر تمہارے استحقاق کی صرف یہی ایک بنیاد ہے تو پھر مسلمان بھی تو اسی بنا پر سپین کی واپسی کا جائز طور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پر مطالبہ کر سکتے ہیں۔ وہاں وہ سات سو سال تک حکمران رہے اور اُس کو چھوڑے ہوئے بھی پانچ سو سال سے زیادہ مدت نہیں گزری"۔

ڈاکٹر میرے اس جواب سے کچھ برہم ہوا اور کہنے لگا۔

"مسلمانوں نے سپین کو فتح کیا تھا یہ اُن کا اپنا وطن نہ تھا اور یہ بالکل درست ہوا کہ ملک کے باشندوں نے انہیں یہاں سے نکال دیا"۔

اسد صاحب نے اس کے جواب میں نہایت ہی نرم لہجے میں کہا۔

حضور معاف کیجئے! اس استدلال میں ایک بنیادی لغزش ہے۔ عبرانی بھی تو یہاں فاتح کی حیثیت سے آئے تھے اس سے پیشتر یہاں پر بے شمار قبائل آباد تھے۔ یہ سب اسرائیل کے عہد میں بھی اس ملک میں رہتے رہے۔ وہ عرب جو شام اور فلسطین کو فتح کرکے یہاں آباد ہوئے اُن کی تعداد مختصر تھی۔ آج ہم جن لوگوں کو شامی عرب یا فلسطینی عرب کہتے ہیں اُن میں بیشتر یہاں کے اصل باشندے ہیں۔ ان میں سے بعض وقت کے گزرنے کے ساتھ مسلمان ہو گئے۔ عرب فاتحین نے ان کے ساتھ شادیاں کیں۔ کیا آپ اس حقیقت سے انکار کرنے کی جرأت کر سکتے ہیں۔ کہ فلسطین کی عربی بولنے والی بیشتر آبادی خواہ وہ عیسائی ہو یا مسلمان۔ یہاں کے اصلی باشندوں کی نسل میں سے نہیں۔ اصلی ان معنوں میں کہ وہ عبرانیوں سے کئی صدیاں پیشتر بھی اس ملک میں رہا کرتے تھے"۔

ڈاکٹر یہ بات سُن کر کھسیانی ہنسی ہنسا اور موضوع کو بدل دینے کی کوشش کی۔

اس کے بعد فاضل مصنف اس مسئلہ کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"میرے لئے یہ بات حیرت کا باعث ہے کہ یہودی قوم جس میں کافی تخلیقی صلاحیتیں موجود ہیں، اس کشمکش کو صرف ایک ہی نقطہ نظر سے کیوں دیکھتی ہے؟

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کیا انہیں اس امر کا احساس نہیں ہے کہ فلسطین میں یہودیوں کا مسئلہ صرف عربوں کے تعاون سے ہی حل ہو سکتا ہے؟ کیا یہودیوں کے اس موجودہ طرزِ عمل سے ان کا مستقبل تاریک نہ ہوگا؟ اگر یہودی یہاں کچھ عرصہ کے لئے کامیاب ہو بھی جائیں، پھر بھی کبھی چین سے نہ بیٹھ سکیں گے اور ایک معاند قوم سے انہیں ہمیشہ خطرہ لاحق رہے گا۔ میں نے سوچا کہ آخر اس کی وجہ کیا ہے کہ ایک قوم جس نے تاریخ میں بے شمار چرکے کھائے ہیں اور مظالم برداشت کئے ہیں وہ اپنی مطلب براری کے لئے ایک دوسری قوم کو تباہ و برباد کر رہی ہے اور یہ قوم بھی وہ ہے جو یہودیوں کے معاملے میں بالکل بے گناہ ہے اس قسم کے تاریخی حادثات انسانیت کے لئے نئے نہیں لیکن میں جب انہیں اپنی آنکھوں کے سامنے وقوع پذیر ہوتے دیکھتا تو میرا دل سخت اضطراب و کرب محسوس کرتا۔"

یہودیوں کے بارے میں اس طرزِ فکر کے اور بھی بے شمار لوگ حامی ہیں۔ جناب اسد صاحب نے اس سلسلہ میں جیکب ڈی ہان (JACOB DE HAAN) کے احساسات کو بھی درج کیا ہے اس کا خیال ہے:-

ہم یہودی اپنے مقدس وطن سے اس لئے نکالے گئے تھے کہ ہم نے اس فرض کی ادائیگی نہیں کی جو خداوند تعالیٰ نے ہم پر عائد کیا تھا۔ ہمیں اللہ تعالیٰ نے اس بات کے لئے منتخب کر رکھا تھا کہ ہم اس کے پیغام کو اس دنیا کے اندر پھیلائیں مگر بدقسمتی سے ہم نے یہ سمجھ لیا کہ خدا کو ہم سے صرف ہماری خاطر محبت ہے۔ اس لئے ہمارے اندر ایک غلط قسم کا پندار پیدا ہو گیا۔ ہمارے لئے اس کے علاوہ اب کوئی چارہ کار نہیں رہا کہ ہم توبہ و استغفار کریں اپنے دل کو تمام آلائشوں سے پاک کریں، اور جب ہم اس کا پیغام پہنچانے کے قابل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوں گے تو وہ ہم میں ایک ایسا مسیحا پیدا کریگا جو ہمیں اپنے ملک میں پھر واپس لے آئیگا ۔"

"مسٹر اسد ! کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تاریخ چند بے ربط اور بے مقصد واقعات کا ایک مجموعہ ہے ۔ خداوند تعالیٰ نے ہم سے یونہی کسی ترنگ میں آکر ہمارا وطن تو نہیں چھینا اور اس لئے ہمیں در بدر کی ٹھوکریں کھانی پڑیں ۔ مگر افسوس کہ یہودی اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے ، وہ ابھی تک اُسی تعصب و تنگ نظری کا شکار ہیں جو ہماری ہلاکت کا باعث بنی ۔ دو ہزار سال کی تکالیف اور صحرا نوردی سے ہم نے کوئی سبق نہیں سیکھا ۔ یہ لوگ بجائے اپنے مصائب کے حقیقی اسباب معلوم کرنے کے انہیں چھپاتے ہیں ۔ وہ مغربی سیاست کے مطابق اپنے گھر کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ اس طرح وہ ایک قوم کو اپنے وطن سے محروم کرنے کا گناہ اپنے سر لے رہے ہیں ۔"

© rasailojaraid.com